پربھوسیوک: ماما! ابھی صوفی کو یہاں دو چار دن اور آرام سے پڑی رہنے دیجیے۔ ابھی اس کو اٹھنے میں تکلیف ہوگی۔ دیکھئے نا کتنی کمزور ہوگئی ہے۔

صوفیہ: رانی جی بھی یہی کہتی تھیں کہ ابھی میں تم کو نہ جانے دوں گی

مسز سیوک: یہ کیوں نہیں کہتی کہ تیرا ہی جی یہاں سے جانے کو نہیں چاہتا۔ وہاں تیرا اتنا پیار کون کرے گا؟

صوفیہ: نہیں ماما! آپ میرے ساتھ بے انصافی کر رہی ہیں۔ میں اب یہاں ایک دن بھی اور نہیں رہنا چاہتی۔ میں اب ان لوگوں کو زیادہ تکلیف نہ دوں گی مگر ایک بات مجھے معلوم ہو جانی چاہیے مجھ پر پھر تو ظلم نہیں کیا جائے گا؟ میری مذہبی آزادی میں پھر تو کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے گی؟

پربھوسیوک: صوفی! تم خواہ مخواہ ان باتوں کا تذکرہ کیوں کرتی ہو؟ تمہارے ساتھ کون سا جبر کیا جاتا ہے۔ ذرا سی بات کا بتنگڑ بناتی ہو۔

مسز سیوک: نہیں تو نے یہ بات پوچھ لی بہت اچھا کیا۔ میں بھی تجھے مغالطہ میں نہیں رکھنا چاہتی میرے گھر میں یسوع کے مخالفین کے لیے جگہ نہیں ہے۔

پربھوسیوک: آپ ناحق اس سے الجھتی ہیں۔ سمجھ لیجیے کوئی ہذیان بک رہی ہے۔

مسز سیوک: کیا کروں؟ میں نے تمہاری طرح فلسفہ نہیں پڑھا۔ واقعہ کو خواب نہیں سمجھ سکتی۔ یہ وصف تو فلاسفروں ہی میں ہو سکتا ہے۔ یہ مت سمجھو کہ مجھے اپنی اولاد سے محبت نہیں ہے۔ خدا جانتا ہے میں نے تمہاری خاطر کیا کیا تکلیفیں نہیں اٹھائیں۔ اس وقت تمہارے پاپا ایک دفتر میں کلرک تھے۔ گھر کا سارا کام کاج مجھی کو کرنا پڑتا تھا۔ بازار جاتی، کھانا پکاتی، جھاڑو لگاتی۔ تم دونوں ہی بچپن میں کمزور تھے۔ روز ہی ایک نہ ایک روگ لگا رہتا تھا۔ گھر کے کاموں سے ذرا فرصت ملتی تو ڈاکٹروں کے پاس جاتی۔ اکثر تمہیں گود میں لیے ہی لیے راتیں کٹ جاتیں۔ اتنی قربانی سے پالی ہوئی اولاد کو جب ایشور سے منحرف ہوتے دیکھتی ہوں تو غم و غصہ سے پاگل ہو جاتی ہوں۔ تمہیں میں سچا ایمان کا پکا

یسوع کا بندہ بنانا چاہتی تھی۔ اس کے برعکس جب تمہیں یسوع سے منہ موڑتے دیکھتی ہوں۔ ان کی زندگی، ان کے وعظ، ان کے معجزات پر شبہ کرتے پاتی ہوں تو میرا دل پاش پاش ہو جاتا ہے اور یہی جی چاہتا ہے کہ اس کی صورت نہ دیکھوں۔ مجھے اپنا مسیح ساری دنیا سے اولاد سے یہاں تک کہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

صوفیہ: آپ کو یسوع اتنا عزیز ہے تو مجھے بھی اپنی روح اپنا ایمان اس سے کم عزیز نہیں ہیں۔ میں ان پر کسی قسم کا جبر ہونا برداشت نہیں کر سکتی۔

مسز سیبوک: خدا تجھے اس کفر کی سزا دے گا۔ میری اس سے یہی دعا ہے کہ پھر مجھے تیری صورت نہ دکھائے۔

یہ کہہ کر مسز سیبوک کمرہ سے باہر نکل آئیں۔ رانی صاحبہ اور اندوا دھر سے آ رہی تھیں۔ دروازہ پر ان سے ملاقات ہو گئی۔ رانی صاحبہ مسز سیبوک کے گلے لپٹ گئیں اور تشکر آمیز الفاظ کا دریا بہا دیا۔ مسز سیبوک کو اس خالص محبت میں بھی تصنع کی بو آئی، لیکن رانی صاحبہ کو مردم شناسی کا ملکہ نہ تھا۔ اندو سے بولیں ''مس صوفیہ سے کہہ دے کہ ابھی جانے کی تیار نہ کرے۔ مسز سیبوک! آپ میری خاطر صوفیہ کو ابھی دو چار روز اور یہاں رہنے دیں۔ میں آپ سے عاجزانہ اصرار کرتی ہوں۔ ابھی میری طبیعت اس کی باتوں سے سیر نہیں ہوئی اور نہ میں اس کی کچھ خدمت ہی کر سکی۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں میں خود اس کو آپ کے پاس پہنچا دوں گی۔ جب تک وہ یہاں رہے گی، آپ سے کم از کم روزانہ ایک مرتبہ ملاقات ہوتی رہے گی۔ آپ خوش نصیب ہیں آپ کو ایسی اچھی لڑکی ملی۔ رحم اور روشن خیالی کا مجسمہ ہے۔ ایثار تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔''

مسز سیبوک: میں اسے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہیں کرتی۔ آپ جتنے دن چاہیں شوق سے رکھیں۔

رانی: بس بس میں اتنا ہی چاہتی تھی آپ نے مجھے خرید لیا۔ آپ سے ایسی ہی امید بھی تھی۔ آپ خود اس قدر خلیق نہ ہوتیں تو صاحبزادی میں یہ اوصاف کہاں سے آتے؟ ایک

میری اندو ہے کہ باتیں کرنے کا بھی طریقہ نہیں جانتی۔ ایک بڑی ریاست کی رانی ہے، پر اتنا بھی نہیں جانتی کہ میری سالانہ آمدنی کیا ہے۔ لاکھوں کے زیورات صندوق میں پڑے ہوئے ہیں۔ انہیں چھوتی تک نہیں۔ ہاں گھومنے کو کہہ دیجیے تو دن بھر گھوما کرے۔ کیوں اندو! جھوٹ کہتی ہوں؟

اندو: تو کیا کروں؟ من بھر سونا لادے بیٹھی رہوں؟ مجھے تو اس طرح اپنے جسم کو جکڑنا اچھا نہیں لگتا۔

رانی: سنی آپ نے اس کی باتیں؟ گہنوں سے اس کا جسم جکڑ جاتا ہے۔ آیئے! اب آپ کو اپنے مکان کی سیر کراؤں۔

مسز سیوک: مسٹر سیوک باہر کھڑے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ دیر ہوگی

رانی: وہ اتنی جلدی! کم از کم آج یہاں کھانا تو تناول فرمالیجیے۔ لنچ کھا کر ہوا کھانے چلیں۔ پھر لوٹ کر کچھ دیر گپ شپ کریں۔ رات کا کھانا کھالینے کے بعد میری موٹر آپ کو گھر پہنچا دے گی۔

مسز سیوک انکار نہ کرسکیں۔ رانی نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے محل کی سیر کرانے لگیں۔ نصف گھنٹہ تک مسز سیوک گویا عالم طلسمات کی سیر کرتی رہیں۔ محل کیا تھا۔ تفریح، آسائش، شوق اور عظمت کا تماشا گاہ تھا۔ سنگ مرمر کے فرش پر قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ چلتے وقت ان میں پیر گھس جاتے تھے۔ دیواروں پر دلفریب مرصع کاری، کمروں کی دیواروں پر بڑے بڑے قد آدم آئینے، نقش و نگار اس قدر خوب صورت کہ آنکھیں محو ہا جائیں۔ شیشہ کی قیمتی کمیاب اشیاء، قدیم مصوروں کی صنعت کے نمونے، چینی کے بڑھیا گلدان، جاپان، چین، یونان اور ایران کے صنعتی کمال کی عمدہ مثالیں۔ سونے کے گملے، لکھنو کے بولتے ہوئے کھلونے، اٹلی کے بنے ہوئے ہاتھی دانت کے پلنگ، لکڑی کے نفیس طاق، دیوار گیریں، کشتیاں، آنکھوں کو لبھانے والی پنجروں میں چہکتی ہوئی طرح طرح کی چڑیاں، صحن میں سنگ مرمر کا حوض اور اس کے کنارے سنگ مرمر کی حوریں۔ مسز سیوک

نے ان ساری چیزوں میں سے کسی کی تعریف نہیں کی۔ کہیں بھی حیرت یا مسرت کا ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ انہیں خوشی کے بجائے حسد ہوتا تھا۔ حسد میں قدر دانی کا مادہ نہیں ہوتا۔ وہ سوچ رہی تھیں۔ ایک یہ خوش قسمت ہیں کہ خدا نے ان کو عیش و تکلف، آرائش و تفریح کی اتنی چیزیں دے رکھی ہیں ایک بدقسمت میں ہوں کہ جھونپڑے میں پڑی ہوئی دن کاٹ رہی ہوں! سجاوٹ اور بناوٹ کا تو ذکر ہی کیا۔ ضروری چیزیں بھی کافی نہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ہم صبح سے شام تک جان توڑ محنت کرتے ہیں۔ یہاں کوئی تنکا تک نہیں اٹھاتا۔ لیکن اس کا غم کیا؟ آسمان کی بادشاہت میں تو امیروں کا حصہ نہیں۔ وہ تو ہماری میراث ہوگی۔ امیر لوگ کتوں کی طرح دھتکارے جائیں گے۔ کوئی جھانکنے تک نہ پائے گا۔

اس خیال سے انہیں گونہ تشفی ہوئی۔ حسد کی ہمہ گیری ہی مساوات عامہ کے اصولوں کی ہر دل عزیزی کا سبب ہے۔ رانی صاحبہ کو تعجب ہو رہا تھا کہ ان کو میری کوئی چیز پسند نہ آئی۔ کسی چیز کی تعریف نہ کی۔ میں نے ایک ایک تصویر اور ایک ایک پیالہ کے لیے ہزاروں روپے خرچ کیے ہیں۔ ایسی چیزیں یہاں اور کس کے پاس ہیں۔ اب نایاب ہیں۔ لاکھوں روپے خرچ کرنے پر بھی نہ ملیں گی۔ کچھ نہیں یا تو یہ بن رہی ہیں یا ان میں اتنی پرکھ نہیں کہ ایسی چیزوں کی قدر کر سکیں۔

اتنے پر بھی رانی صاحبہ مایوس نہیں ہوئیں۔ ان کو اپنا باغ دکھانے لگیں۔ طرح طرح کے پھول اور پودے دکھائے مالی بڑا ہوشیار تھا۔ ہر پودے کے حالات و اوصاف بیان کرتا جاتا تھا۔ کہاں سے آیا، کب آیا، کس طرح نصب کیا گیا۔ کیسے اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔ پر مسز سیوک کا منہ اب بھی نہ کھلا۔ یہاں تک کہ آخر میں اس نے ایک ایسی ننھی سی جڑی بوٹی دکھائی جو یروشلم سے لائی گئی تھی۔ کنور صاحب اسے خود ہی نہایت احتیاط سے لائے تھے اور اس میں ایک ایک پتی کا نکلنا ان کے لیے ایک ایک خوشخبری تھی۔ مسز سیوک نے فوراً ہی اس گملے کو اٹھا لیا۔ اسے آنکھوں سے لگایا اور پتیوں کو بوسہ دیا بولیں"

میری خوش نصیبی ہے کہ اس نایاب شے کی زیارت نصیب ہوئی'' رانی نے کہا ''کنور صاحب خود اس کی نہایت قدر کرتے ہیں۔ اگر یہ آج خشک ہو جائے تو دو روز تک وہ یقیناً کھانا نہ کھائیں''

اس اثنا میں چائے تیار ہوئی۔ مسز سیوک لنچ پر بیٹھیں۔ رانی جی کو چائے سے رغبت نہ تھی۔ وہ نے اور اندو کے بارے میں باتیں کرنے لگیں۔ وہ نے کے عادات و اخلاق، خدمت و اطاعت، جود و سخا کی تعریف کی۔ یہاں تک کہ مسز سیوک کا جی اکتا گیا۔ اس کے جواب میں وہ اپنی اولاد کی ثنا خوانی نہ کر سکتی تھیں۔

ادھر مسٹر جان سیوک اور کنور صاحب دیوان خانہ میں بیٹھے لنچ تناول کر رہے تھے۔ چائے اور انڈوں سے کنور صاحب کو رغبت نہ تھی۔ وہ نے بھی ان دونوں چیزوں کو قابل ترک سمجھتے تھے۔ جان سیوک ان آدمیوں میں تھے جن کی شخصیت جلد ہی دوسرے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ان کی باتیں اس قدر عالمانہ ہوتی تھیں کہ اور لوگ اپنی باتیں بھول کر انہیں کی سننے لگتے تھے۔ اور یہ بات نہ تھی کہ ان کی گفتگو میں فقط لسانی ہو۔ ان کے معلومات وسیع تھے۔ ان کو طبائع انسانی کا اچھا خاصا تجربہ تھا۔ ذہانت خداداد تھی جس کے بغیر کسی مجلس میں عزت نہیں مل سکتی۔ اس وقت وہ ملک کی صنعت و حرفت کی تباہی پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ موقع سے ان تجاویز کا بھی ذکر کرتے جاتے تھے جو ان حالات کے اصلاح کی لیے انہوں نے سوچ رکھی تھیں۔ آخر میں بولے ہمارے ملک کی نجات صنعت و حرفت کی ترقی میں ہے۔ اس سگریٹ کے کارخانہ سے کم از کم ایک ہزار آدمیوں کے کسب معاش کی صورت نکل آئے گی اور ان کا بار زراعت کے سر سے دور ہو جائے گا۔ جتنی زمین کو ایک شخص بخوبی کاشت کر سکتا ہے اس میں گھر بھر کا لگا رہنا بالکل فضول ہے۔ میرا کارخانہ ایسے بیکاروں کو اپنی روٹی کمانے کا موقع دے گا۔

کنور صاحب: لیکن جن کھیتوں میں اس وقت اناج بویا جاتا ہے انہیں میں تمباکو کی کاشت ہوگی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اناج اور مہنگا ہو جائے گا۔

جان سیوک: میری سمجھ میں تمباکو کی کاشت کا اثر جوٹ، سن، تلہن اور افیون پر پڑے گا۔ رفتنی والی جنس کچھ کم ہو جائے گی۔ غلہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ پھر ہم اس اراضی کو بھی مزروعہ بنانے کی کوشش کریں گے جو ابھی تک برتی پڑی ہوئی ہے۔

کنور صاحب: لیکن تمباکو کوئی اچھی چیز تو نہیں۔ اس کا شمار مسکرات میں ہے اور اس کا اثر صحت پر برا ہی پڑتا ہے۔

جان سیوک: (ہنس کر) یہ سب ڈاکٹروں کی محض فرضی باتیں ہیں، جن پر سنجیدگی سے غور کرنے کی مطلقاً ضرورت نہیں۔ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق اگر ہم زندگی بسر کرنا چاہیں تو زندی کا خاتمہ ہی ہو جائے۔ دودھ میں دق وسل کے جراثیم ہیں۔ گھی میں چربی کی مقدار زیادہ ہے۔ چائے اور قہوہ محرک ہیں۔ یہاں تک کہ سانس لینے سے بھی امراض کے جراثیم بدن میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق تو ساری دنیا کیڑوں سے بھری ہوئی ہے جو ہماری جان لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ کاروباری لوگ ان گورکھ دھندوں میں نہیں پھنستے۔ ان کا تعلق صرف حالات حاضرہ سے ہوا کرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے یہاں ممالک غیر سے کروڑوں روپے کے سگریٹ اور سگار آتے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اس روپیوں کے بہاؤ کو دوسرے ملکوں میں جانے سے روکیں۔ اس کے بغیر ہماری اقتصادی زندگی کی نمو ناممکن ہے۔

یہ کہہ کر انہوں نے کنور صاحب کو فاتحانہ انداز سے دیکھا۔ کنور صاحب کے شکوک بہت کچھ رفع ہو چکے تھے۔ عموماً معترض کو لاجواب ہوتے دیکھ کر ہم زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں۔ بچہ بھی بھاگتے ہوئے کتے پر بے خوف ہو کر پتھر پھینکتا ہے۔

جان سیوک بے خوف ہو کر بولے: میں نے ان تمام پہلوؤں پر غور کر کے یہ رائے قائم کی اور آپ کے خادم کو (پربھو سیوک کی طرف اشارہ کر کے) اس فن میں ماہر ہونے کے لیے امریکہ بھیجا۔ میری کمپنی کے بیشتر حصے فروخت ہو چکے ہیں لیکن ابھی روپے نہیں وصول ہوئے۔ ان اطراف میں ابھی تک مشترکہ کاروبار کرنے کا رواج نہیں۔

لوگوں میں اعتبار نہیں۔ اس لیے میں ابھی نے صرف دس فی صدی سرمایہ وصول کر کے کام شروع کر دینا تجویز کیا ہے۔ سال دو سال میں جب امید سے زیادہ کامیابی ہو گی اور سالانہ نفع ہونے لگے گا تو سرمایہ خود بخود دوڑا ہوا چلا آئے گا۔ چھت پر بیٹھا ہوا کبوتر آ آ کی آواز سن کر خوف زدہ ہو جاتا ہے اور زمین پر نہیں اترتا، مگر تھوڑا سا دانہ بکھیر دیجیے تو فوراً اتر آتا ہے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اول ہی سال ہم کو 25 فی صدی نفع ہو گی۔ پراسپکٹس حاضر ہے۔ اسے بغور ملاحظہ فرمائیے۔ میں نے منافع کا اندازہ کرنے میں نہایت احتیاط سے کام لیا ہے۔ خواہ زیادہ ہو جائے کم تو ہو ہی نہیں سکتا۔

کنور صاحب: پہلے ہی سال 25 فی صدی

جان سیوک: جی ہاں بڑی آسانی سے، آپ سے میں حصہ خریدنے کی درخواست کرتا، لیکن جب تک ایک سال کا منافع دکھلا نہ دوں اصرار نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ ضرور عرض کروں گا کہ اس حالت میں ممکن ہے حصے برابر پر نہ مل سکیں۔ سو کے حصے شاید دو سو پر ملیں۔

کنور صاحب: مجھے اب ایک ہی شک اور ہے۔ اگر اس کاروبار میں اس قدر منافع ہو سکتا ہے تو اب تک ایسی اور کمپنیاں کیوں نہ قائم ہوئیں؟

جان سیوک: (ہنس کر) اس لیے کہ ابھی تک تعلیم یافتہ جماعت میں کاروبار میں تمیز پیدا نہیں ہوئی۔ لوگوں کی رگ رگ میں غلامی بھری ہوئی ہے۔ وکالت یا سرکاری ملازمت کے سوا اور کسی طرف نگاہ جاتی ہی نہیں۔ دو چار کمپنیاں کھلیں بھی لیکن انہیں کسی ماہر کی رائے اور تجربہ سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ اگر ملا بھی تو بہت مہنگا پڑا۔ مشینری منگانے میں ایک کے دو دینے پڑے۔ بندوبست معقول نہ ہو سکا۔ مجبوراً ان کا کاروبار بند کرنا پڑا۔ یہاں بالعموم سبھی کمپنیوں کا یہی حال ہے۔ ڈائرکٹروں کی جیبیں بھری جاتی ہیں۔ حصے بیچنے اور اشتہار دینے میں لاکھوں روپے اڑا دیئے جاتے ہیں۔ نہایت فیاضی سے دلالوں کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ عمارتوں پر سرمایہ کا بیشتر حصہ صرف کر دیا جاتا ہے۔ مینجر کو بھی بہت زیادہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ ڈائریکٹر صاحبان اپنی

جیبیں بھرتے ہیں۔ مینیجر اپنی تنخواہ سے مستفید ہوتا ہے۔ دلال اپنی دلالی لیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس طرح سارا سرمایہ اوپر ہی اڑ جاتا ہے۔ میرا اصول ہے کم سے کم خرچ اور زیادہ سے زیادہ نفع۔ میں نے دلالی ایک کوڑی نہیں دی۔ اشتہاروں کی مد اڑا دی۔ یہاں تک کہ میں نے مینیجر کو بھی صرف پانچ سو روپے مشاہرہ دینا طے کیا ہے۔ حالانکہ کسی دوسرے کارخانہ میں ایک ہزار آسانی سے مل جاتے ہیں۔ اس پر گھر کا آدمی۔ ڈائریکٹروں کے بارے میں بھی میری یہ تجویز ہے کہ سفر خرچ کے سوا اور کچھ نہ دیا جائے۔

کنور صاحب دنیاوی آدمی نہ تھے۔ ان کا زیادہ وقت صرف مذہبی کتب کے مطالعہ کے نذر ہوتا تھا۔ وہ کسی ایسے کام میں شریک نہ ہونا چاہتے تھے جو ان کی مذہبی یکسوئی میں خلل انداز ہو۔ برے لوگوں نے انہیں انسانی عادات کا نکتہ چین بنا دیا تھا۔ انہیں کسی پر اعتبار نہ ہوتا تھا۔ مدرسوں اور یتیم خانوں کو چندہ دیتے ہوئے وہ بہت ڈرتے تھے اور اکثر ان معاملات میں حدود مناسب سے بھی تجاوز کر جاتے تھے۔ مستحقین کو بھی ان سے مایوس ہو جانا پڑتا تھا، لیکن احتیاط میں نفع کا یقین ہو جانے پر حد سے زیادہ بے احتیاطی پیدا ہو جاتی ہے۔ مسٹر جان سیوک کی تقریر تاجرانہ معاملہ فہمی سے مملو تھی، مگر کنور صاحب پر اس سے زیادہ اثر ان کی شخصیت کا پڑا۔ وہ اب ان کی نگاہوں میں صرف دولت کے پجاری نہ تھے، بلکہ ایک خیر خواہ دوست۔ ایسا شخص انہیں مغالطہ نہ دے سکتا تھا۔ بولے، جب آپ اتنی کفایت سے کام کریں گے تو آپ کا کارخانہ ضرور سرسبز ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ آپ کو شاید ابھی معلوم نہ ہو۔ میں نے یہاں ایک سیوا سمتی قائم کر رکھی ہے۔ کچھ دنوں سے یہی خبط سوار ہے۔ اس میں اس وقت تقریباً ایک سو والنٹیر ہیں۔ میلوں میں عوام کی حفاظت اور خدمت کرنا اس کا کام ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو مالی مشکلات سے ہمیشہ کے لیے فراغت کر دوں۔ ہمارے یہاں کی کام کرنے والی جماعتیں اکثر روپیہ کی کمی کی وجہ سے صرف چند روز زندہ رہتی ہیں۔ میں اپنی اس جماعت کو مضبوط بنانا چاہتا ہوں اور میری یہ دلی تمنا ہے کہ اس سے ملک میں کچھ بہتری ہو۔ میں اس کام میں کسی سے کچھ مدد

نہیں لینا چاہتا۔ اس کو بلا کسی رکاوٹ کے جاری رکھنے کے لیے میں ایک مستقل سرمایہ کی فراہمی کا بندوبست کر دینا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو اپنا دوست اور خیر خواہ سمجھ کر دریافت کرتا ہوں کہ کے آپ کے کارخانے میں حصہ لے لینے سے میرا مقصد حاصل ہو سکتا ہے؟ آپ کے خیال میں کس قدر روپیہ لگا دینے سے ایک ہزار ماہوار کی آمدنی ہو سکتی ہے۔

جان سیوک کی کاروباری طمع نے ابھی ان کے نیک ارادوں کو زائل نہیں کر دیا تھا۔ کنور صاحب نے ان کی رائے پر فیصلہ چھوڑ کر انہیں شش و پنج میں ڈال دیا۔ اگر ان کو پہلے سے معلوم ہوتا کہ یہ مسئلہ درپیش ہوگا تو نفع کا تخمینہ بتلانے میں زیادہ احتیاط سے کام لیتے۔ غیروں سے چال بازی کرنا قابل عفو سمجھا جاتا ہے، لیکن ایسے خودغرضی کے بندے کم ملیں گے جو دوستوں سے دغا کریں۔ سادہ مزاج کے آدمیوں کے سامنے فریب بھی شرمندہ ہو جاتا ہے۔

جان سیوک ایسا جواب دینا چاہتے تھے جس میں اپنے فائدہ کا لحاظ بھی ہو اور اپنے ضمیر کا بھی بولے، ''کمپنی کی جو کچھ حالت ہے وہ میں نے بے کم و کاست آپ سے بیان کر دی۔ اس کے جاری رکھنے کی ترکیبیں بھی آپ سے بتلا چکا ہوں۔ میں نے کامیابی کے جملہ ذرائع پر نگاہ رکھی ہے۔ اس پر بھی ممکن ہے مجھ سے غلطیاں ہو گئی ہوں۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ انسان خدا کے ہاتھوں کا صرف ایک کھلونا ہے۔ اس کا سارا قیاس، ساری عقل مندی، ساری خیر اندیشی قدرتی طاقت کے محتاج ہیں۔ تمباکو کی پیداوار بڑھانے کے لیے کاشتکاروں کو پیشگی رقمیں دینی ہی پڑیں گی۔ ایک رات کا پالا کمپنی کے لیے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ جلتے ہوئے سگریٹ کا ایک ٹکڑا کل کارخانہ کو خاک سیاہ کر سکتا ہے۔ ہاں میری محدود عقل کی وسعت جہاں تک ہے، میں نے کوئی بات مبالغہ کے ساتھ نہیں کہی ہے۔ ناگہانی حادثات کے خیال سے آپ نفع کے تخمینہ میں کسی قدر تخفیف کر سکتے ہیں۔''

کنور صاحب: آخر کہاں تک؟

جان سیوک: بیس فی صد سمجھیے

کنور صاحب: اور پہلے سال!

جان سیوک: کم از کم پندرہ فی صدی

کنور صاحب: میں پہلے سال دس اور اس کے بعد پندرہ فیصدی پر قناعت کر سکوں گا۔

جان سیوک: تو پھر میں آپ سے یہی کہوں گا کہ آپ حصے خریدنے میں توقف نہ کریں۔ خدا نے چاہا تو آپ کو کبھی مایوسی نہ ہوگی۔

حصے سو روپے کے تھے۔ کنور صاحب نے پانچ سو حصے خرید لینے کا وعدہ کیا۔ اور بولے ''کل اول قسط کے دس ہزار روپے بینک کی معرفت آپ کے پاس بھیج دوں گا۔''

جان سیوک کا زیادہ سے زیادہ تخمینہ بھی اس حد تک کا نہ تھا لیکن وہ اس کامیابی پر خوش نہ ہوئے۔ ان کا ضمیر اب بھی انہیں ملامت کر رہا تھا۔ تم نے ایک سادہ مزاج شریف آدمی کو دھوکا دیا۔ تم نے ملک کی تجاتی ترقی کے لئے نہیں بلکہ اپنے فائدہ کے لئے یہ کوشش کی ہے۔ ملک کے خادم بن کر تم اپنی پانچوں انگلیاں گھی میں رکھنا چاہتے ہو۔ تمہارا دلی منشا یہی ہے کہ منافع کا معتد بہ حصہ کسی نہ کسی حیلہ سے خود ہضم کرو۔ تم نے اس کہاوت پر عمل کیا کہ بنیا مارے جان۔ چور مارے انجان۔

اگر کنور صاحب کی شرکت سے عوام میں کمپنی کی ساکھ قائم ہو جانے کا یقین نہ ہوتا تو مسٹر جان سیوک صاف کہہ دیتے کہ کمپنی اتنے حصے آپ کو نہیں دے سکتی۔ ایک مفید خلایق جماعت کے روپے کو کسی مشتبہ کاروبار میں لگا کر اس کی ہستی کو معرض خطر میں ڈالنا خود غرضی کے لئے بھی ایک لقمہ تلخ تھا، مگر دولت کا دیوتا ضمیر کی قربانی ہوئے بغیر خوش نہ ہوتا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اب تک وہ اس کام کو محض ذاتی نفع کے لئے کرنا چاہتے تھے۔ ان کی نیت صاف نہیں تھی۔ منافع کو مختلف ناموں سے اپنے ہی ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ اب انہوں نے بے لوثی کے ساتھ نیک نیتی سے برتاؤ

کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ بولے۔ ''میں کمپنی کے منتظم کی حیثیت سے اس امداد کے لیے آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ خدا نے چاہا تو آپ کو اس اپنے فیصلہ پر کبھی کف افسوس نہ ملنا پڑے گا۔ اب میں آپ سے ایک اور استدعا کرتا ہوں۔ کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ۔ میں نے کارخانہ کے لیے جو زمین پسند کی ہے، وہ پانڈے پور کے آگے پختہ سڑک پر واقع ہے۔ ریلوے اسٹیشن بھی وہاں سے نزدیک ہے اور قرب و جوار میں بہت سے موضع ہیں۔ رقبہ دس بیگہ کا ہے۔ زمین پرتی پڑی ہوئی ہے۔ ہاں گاؤں کے مواشی اس میں چرنے آیا کرتے ہیں۔ اس کا مالک ایک اندھا فقیر ہے۔ اگر آپ کبھی اس طرف ہوا خوری کے لیے گئے ہوں گے تو آپ نے اس اندھے کو ضرور دیکھا ہوگا۔''

کنور صاحب: ہاں ہاں۔ ابھی تو کل ہی گیا تھا۔ وہی اندھا ہے۔ نا؟ کالا کالا۔ دبلا دبلا۔ جو گاڑیوں کے پیچھے دوڑا کرتا ہے؟

جان سیوک: جی ہاں۔ وہی وہی۔ وہ زمین اسی کی ہے، مگر وہ اس زمین کو کسی قیمت پر بھی نہیں دینا چاہتا۔ میں اسے پانچ ہزار تک دیتا تھا وہ راضی نہ ہوا۔ وہ کچھ سڑی سا ہے۔ کہتا ہے میں یہاں دھرمسالہ، مندر اور تالاب بنواؤں گا۔ دن بھر بھیک مانگ کر تو گزر کرتا ہے۔ اس پر ارادے اتنے بلند ہیں۔ شاید محلّہ والوں کے خوف سے اسے کوئی معاملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ میں ایک ذاتی معاملہ میں حکام سے مدد لینا مناسب نہیں سمجھتا، لیکن ایسی حالت میں بجز اس کے اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا اور پھر یہ بالکل میرا ذاتی معاملہ بھی نہیں ہے۔ میونسپلٹی اور سرکار دونوں کو اس کارخانہ سے ہزاروں روپے کی آمدنی ہوگی۔ ہزاروں تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کا بھلا ہوگا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو یہ ایک قومی کام ہے اور پس سرکار سے امداد حاصل کرنے میں میں واجبیت کے خلاف نہیں کرتا۔ اگر آپ ذرا توجہ کریں تو نہایت آسانی سے کام نکل جائے۔

کنور صاحب: میرا اس فقیر پر کوئی دباؤ نہیں۔ اور ہوتا بھی تو میں اس سے کام نہ لیتا۔

جان سیوک: آپ راجہ صاحب چتاری.....

کنور صاحب: نہیں میں ان سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ میرے داماد ہیں اور اس معاملہ میں میرا ان سے کہنا قرین مصلحت نہیں ہے۔ کیا وہ آپ کے حصہ دار نہیں ہیں؟

جان سیوک: جی نہیں۔ وہ خود بے انتہا دولت کے مالک ہو کر بھی دولت مندوں سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کل کارخانے سرمایہ داروں کا قابو بڑھا کر عوام کو مضرت پہنچاتے ہیں۔ انہیں خیالات نے تو ان کو یہاں چیئرمین بنا دیا۔

کنور صاحب: یہ تو اپنا اپنا عقیدہ ہے۔ ہم دو رنگی زندگی بسر کر رہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ حقوق عامہ کے حامی جتنے اونچے درجہ کے لوگوں میں ملیں گے، اتنے نیچے درجہ کے آدمیوں میں نہ ملیں گے۔ خیر آپ ان سے مل کر دیکھئے تو۔ کیا کہوں شہر کے متصل میری ایک ایکڑ زمین بھی نہیں ہے۔ ورنہ آپ کو یہ دقت نہ ہوتی۔ میرے لایق اور جو کام ہو اس کے لیے حاضر ہوں۔

جان سیوک: جی نہیں۔ میں آپ کو زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ میں خود ان سے مل کر طے کر لوں گا۔

کنور صاحب: ابھی تو مس صوفیہ کامل صحت یاب ہونے تک یہیں رہے گی نا؟ آپ کو تو اس میں کوئی عذر نہیں ہے؟

مسٹر جان سیوک اس بارے میں صرف دو چار باتیں کر کے یہاں سے رخصت ہوئے۔ مسز سیوک فٹن پر پہلے ہی سے آ بیٹھی تھیں۔ پربھو سیوک ونے کے ساتھ باغ میں ٹہل رہے تھے۔ ونے نے آ کر جان سیوک سے ہاتھ ملایا۔ پربھو سیوک ان سے اگلے روز پھر ملنے کا وعدہ کر کے جان سیوک کے ساتھ چلے۔ راستہ میں باتیں ہونے لگیں۔

جان سیوک: آج ایک ملاقات میں جتنا کام ہوا، اتنا مہینوں کی دوا دوش سے بھی نہ ہوا تھا۔ کنور صاحب نہایت شریف آدمی ہیں۔ پچاس ہزار کے حصے خرید لیے۔ ایسے ہی دو چار بھلے آدمی اور مل جائیں تو بیڑا پار ہے۔

پربھوسیوک: اس گھر کے سبھی لوگ دیا اور دھرم کے پتلے ہیں۔ میں نے ونے سنگھ جیسا رموز شاعری سے واقف شخص نہیں دیکھا۔ مجھے تو ان سے بے حد محبت ہوگئی ہے۔

جان سیوک: کچھ کام کی بات چیت بھی کی؟

پربھوسیوک: جی نہیں۔ آپ کے نزدیک جو کام کی بات چیت ہے، ان کو اس سے ذرا رغبت نہیں۔ وہ خدمت عامہ کا عہد کر چکے ہیں اور اتنی دیر تک اپنی سیوا سمتی کی ہی چرچا کرتے رہے۔

جان سیوک: کیا تم کو یہ امید ہے کہ تمہاری ملاقات چتاری کے راجہ صاحب پر بھی کچھ اثر ڈال سکتی ہے؟ ونے سنگھ راجہ صاحب سے ہمارا کچھ کام نکلوا سکتے ہیں؟

پربھوسیوک: ان سے کہے کون؟ مجھ میں تو اتنی ہمت نہیں ہے۔ انہیں آپ وطن پرست سنیاسی سمجھئے۔ مجھ سے اپنی سمتی میں شامل ہو جانے کے لیے بہت اصرار کیا ہے۔

جان سیوک: شامل ہو گئے نا؟

پربھوسیوک: جی نہیں۔ کہہ آیا ہوں کہ سوچ کر جواب دوں گا۔ بلا غور و خوض کے ایسا مشکل عہد کس طرح کر لیتا؟

جان سیوک: مگر سوچنے سمجھنے میں مہینوں نہ لگا دینا۔ دو چار روز میں آ کر نام لکھا لینا۔ جبھی تم کو ان سے کچھ کام کی باتیں کرنے کا حق حاصل ہو جائے گا (بیوی سے) تمہاری رانی صاحبہ سے کیسی نبھی؟

مسز سیوک: مجھے تو ان سے نفرت ہوگئی۔ میں نے کسی میں اتنا غرور نہیں دیکھا۔

پربھوسیوک: ماما! آپ ان کے ساتھ سخت ناانصافی کر رہی ہیں۔

مسز سیوک: تمہارے لیے دیوی ہوں گی۔ میرے لیے تو نہیں ہیں۔

جان سیوک: یہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تمہاری ان سے نہ پٹے گی۔ کام کی باتیں نہ تمہیں آتی ہیں، نہ انہیں۔ تمہارا کام تو دوسروں میں عیب نکالنا ہے۔ صوفی کو کیوں نہیں لائیں؟

مسز سیوک: وہ آئے بھی تو یا جبراً گھسیٹ لاتی؟

جان سیوک: آئی نہیں یارانی نے آنے نہیں دیا؟

پربھو سیوک: وہ تو آنے کو تیار تھی، مگر اسی شرط پر کہ مجھ پر مذہبی معاملات میں کوئی جبر نہ کیا جائے۔

جان سیوک: انہیں یہ شرط کیوں منظور ہونے لگی؟

مسز سیوک: ہاں۔ اس شرط پر میں اس کو نہیں لا سکتی۔ وہ میرے گھر رہے گی تو میری بات ماننی پڑے گی؟

جان سیوک: تم دونوں میں سے ایک کو بھی عقل سے سروکار نہیں۔ تم احمق ہو۔ وہ ضدی۔ اس کو کسی طرح منا کر جلد لانا چاہیے۔

پربھو سیوک: اگر ماما اپنی بات پر اڑی رہیں گی تو شاید وہ پھر گھر نہ جائے۔

جان سیوک: آخر جائے گی کہاں؟

پربھو سیوک: اسے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ رانی اس پر جان دیتی ہیں۔

جان سیوک: یہ بیل منڈھے چڑھنے کی نہیں۔ دو میں سے ایک کو دبنا پڑے گا۔

لوگ گھر پہنچے تو گاڑی کی آہٹ پاتے ہی ایشور سیوک نے بڑے محبت آمیز اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔ ''صوفی آ گئی نا؟ آ تجھے گلے لگا لوں، یسوع تجھے دامن میں لے!''

جان سیوک: پاپا! وہ ابھی یہاں آنے کے قابل نہیں ہے۔ بہت کمزور ہو گئی ہے۔ دو چار دن کے بعد آئے گی۔

ایشور سیوک: غضب خدا کا! اس کی یہ حالت ہے اور تم سب اسے اس کے حال پر چھوڑ آئے! کیا تم لوگوں میں ذرا بھی غیرت و حمیت نہیں؟ بالکل خون سفید ہو گیا؟

مسز سیوک: آپ جا کر اس کی خوشامد کیجیے گا تو آئے گی۔ میرے کہنے سے تو نہیں آئی۔ بچی تو نہیں کہ گود میں اٹھا لاتی۔

جان سیوک: پاپا! وہاں بہت آرام سے ہے۔ راجہ اور رانی دونوں ہی اس کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو رانی ہی نے اس کو نہیں چھوڑا۔

ایشو رسیوک: کنور صاحب سے کچھ کام کی بات چیت بھی ہوئی؟

جان سیوک: جی ہاں مبارک ہو۔ پچاس ہزار کی رقم ہاتھ لگی۔

ایشو رسیوک: شکر ہے شکر ہے۔ یسوع! مجھ پر اپنا سایہ کر۔

(4)

شریر لڑکوں کے لیے اندھے دل بہلاؤ کی چیز ہوا کرتے ہیں۔ سورداس کو ان کی بے رحمانہ حرکتوں سے اتنی تکلیف ہوتی تھی کہ وہ منہ اندھیرے گھر سے نکل پڑتا اور چراغ جلنے کے بعد واپس آتا۔ جس روز اس کو جانے میں دیر ہو جاتی، اس دن وہ بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا۔ سڑک پر راہ گیروں کے سامنے اس کو کوئی خوف نہ تھا، لیکن آبادی کی گلیوں میں قدم قدم پر کسی سانحہ کا اندیشہ قائم رہتا۔ کوئی اس کی لاٹھی چھین کر بھاگتا۔ کوئی کہتا۔ ''سورداس! سامنے گڑھا ہے! بائیں ہاتھ ہو جاؤ۔'' سورداس ادھر گھومتا تو گڑھے میں گر پڑتا، مگر بجرنگی کا لڑکا گھیسو اتنا شریر تھا کہ وہ محض سورداس کو چھیڑنے کے لیے گھڑی رات رہے، اٹھ بیٹھتا۔ اس کی لاٹھی چھین کر بھاگنے میں اسے بڑی خوشی ہوتی۔

ایک روز قبل طلوع آفتاب سورداس گھر سے چلے تو گھیسو ایک تنگ گلی میں چھپا ہوا کھڑا تھا۔ سورداس کو وہاں پہنچتے ہی کچھ شک ہوا۔ وہ کھڑا ہو کر آہٹ لینے لگا۔ اب گھیسو ہنسی کو ضبط نہ کر سکا۔ اس نے جھپٹ کر سورداس کا ڈنڈا پکڑ لیا۔ سورداس ڈنڈے کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ گھیسو نے پورے طاقت سے کھینچا۔ ہاتھ پھسل گیا۔ اپنے ہی زور میں گر پڑا۔ سر میں چوٹ لگی۔ خون نکل آیا۔ اس نے خون دیکھا تو چیختا چلاتا گھر پہنچا۔ بجرنگی نے پوچھا۔ ''کیوں روتا ہے رے! کیا ہوا؟'' گھیسو نے اس کو کچھ جواب نہ دیا۔ لڑکے خوب جانتے ہیں کہ کس عدالت میں ان کی

جیت ہوگی۔ جا کر اپنی ماں سے بولا۔ ''سورداس نے مجھے دھکیل دیا۔'' ماں سے سر کی چوٹ کا خون دیکھا تو آنکھوں میں خون اتر آیا۔ لڑکے کا ہاتھ پکڑے ہوئے بجرنگی کے سامنے جا کھڑی ہوگئی۔ اور بولی۔ ''اب اس اندھے کی شامت آ گئی ہے۔ لڑکے کو ایسا دھکیلا کہ لہولہان ہوگیا۔ اس کی اتنی ہمت؟ روپیہ کا گھمنڈ اتار دوں گی!'' بجرنگی نے مصالحانہ لہجہ میں کہا۔ ''اسی نے کچھ چھیڑا ہوگا۔ وہ بے چارہ تو اس سے آپ اپنی جان چھپاتا پھرتا ہے۔''

جمنی: اسی نے چھیڑا تھا سہی۔ تو بھی کیا اس کو اتنی بیدردی سے دھکیل دینا چاہیے تھا کہ سر پھٹ جائے؟ اندھوں کو سبھی لڑکے چھیڑتے ہیں، پر وہ سب سے لٹھیاؤ نہیں کرتے پھرتے۔

اتنے میں سورداس بھی آ کر کھڑا ہوگیا۔ چہرہ سے ندامت برس رہی تھی۔ جمنی لپک کر اس کے سامنے آئی اور بجلی کی طرح کڑک کر بولی۔ ''کیوں سورداس؟ شام ہوتے ہی روز لوٹیا لے کر دودھ کے لیے سر پر سوار ہو جاتے ہو اور ابھی گھیسو نے ذرا لاٹھی پکڑ لی تو اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ جس پتل میں کھاتے ہو، اسی میں چھید کرتے ہو۔ کیوں روپے کا گھمنڈ ہوگیا ہے کیا؟''

سورداس: بھگوان جانتے ہیں جو میں نے گھیسو کو پہچانا ہو۔ سمجھا کوئی شریر لونڈا ہوگا۔ لاٹھی کو مضبوط پکڑے رہا۔ گھیسو کا ہاتھ پھسل گیا۔ وہ گر پڑا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ گھیسو ہے تو لاٹھی اس کو دے دیتا۔ اتنے دن ہو گئے کوئی مجھے کہہ دے کہ میں نے کسی لڑکے کو جھوٹ موٹ بھی مارا ہے۔ تمہارا ہی دیا کھاتا ہوں۔ تمہارے ہی لڑکے کو ماروں گا۔

جمنی: نہیں اب تمہیں گھمنڈ ہوگیا ہے۔ بھیک مانگتے ہو۔ پھر بھی لاج نہیں آتی۔ سب کی برابری کرنے کو پھرتے ہو۔ آج میں لہو کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ نہیں تو جن ہاتھوں سے تم نے اس کو دھکیلا ہے، اس میں ٹوکا لگا دیتی۔

بجرنگی جمنی کو منع کر رہا تھا اور لوگ بھی سمجھا رہے تھے، مگر وہ کسی کی نہ سنتی تھی۔ سورداس

مجرموں کی طرح سر جھکائے پھٹکاریں سن رہا تھا۔ منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالتا تھا۔

بھیرو تاڑی اتارنے جا رہا تھا۔ رک گیا اور سورداس پر دو چار چھینٹے جما دیئے۔ ''زمانہ ہی ایسا ہے۔ سب روزگاروں سے بڑھ کر بھیک مانگنا۔ ابھی چار دن پہلے گھر میں بھونی بھانگ نہ تھی۔ اب چار پیسے کے آدمی ہو گئے ہیں۔ پیسے ہوتے ہیں تبھی گھمنڈ ہوتا ہے۔ نہیں تو کیا گھمنڈ کریں گے ہم اور تم جن کی ایک روپیہ کمائی ہے اور دو کا خرچ ہے۔''

جگدھر اوروں سے تو بھیگی بلی بنا رہتا تھا، سورداس کو لعنت ملامت کرنے کے لیے وہ بھی نکل پڑا۔ سورداس پچھتا رہا تھا کہ میں نے لاٹھی کیوں نہ چھوڑ دی۔ کون کہے کہ کوئی دوسری لکڑی نہ ملتی؟ جگدھر اور بھیرو کے سخت الفاظ سن کر وہ اور بھی ملول ہو رہا تھا۔ اسے اپنی بیکسی پر رونا آتا تھا۔ اسی اثنا میں مٹھوا بھی آ پہنچا۔ یہ بھی شرارت کا پتلا تھا۔ گھیسو سے بھی دو انگل بڑھا ہوا۔ جگدھر کو دیکھتے ہی یہ بول سنا سنا کر چڑانے لگا۔ لالو کا لال منہ جگدھر کا کالا۔ جگدھر تو ہو گیا لالو کا سالا۔

بھیرو کو بھی اس نے ایک اپنا بنایا ہوا بول سنایا۔ ''بھیرو بھیرو تاڑی بیچ۔ یا بیوی کی ساڑی بیچ۔''

چڑنے والے چڑتے کیوں ہیں؟ اس کی تحقیقات تو علم الخیال کے ماہرین بھی کر سکتے ہیں۔ ہم نے لوگوں کو بالعموم پریم یا بھگتی کی وجہ سے چڑتے دیکھا ہے۔ کوئی رام یا کرشن کے ناموں سے اس لیے چڑتا ہے کہ لوگ اسے چڑانے ہی کے بہانے ایشور کا نام لیں۔ کوئی اس لیے چڑاتا ہے کہ لڑکے اس کو گھیرے رہیں۔ کوئی بینگن یا مچھلی سے اس لیے چڑاتا ہے کہ لوگ ان نہ کھانے لائق چیزوں سے نفرت کریں۔ خلاصہ یہ کہ چڑنا ایک فلسفیانہ عمل ہے۔ اس کا مقصد صرف سبق دینا ہے، لیکن بھیرو اور جگدھر میں یہ عقیدت مندانہ فیاضی کہاں۔ وہ بچوں کے طفلانہ مشاغل سے لطف اٹھانا کیا جانیں۔ دونوں جھلا اٹھے۔ جگدھر مٹھوا کو گالیاں دینے لگا، لیکن بھیرو کو محض گالیاں دینے سے صبر نہ ہوا۔ اس نے لپک کر مٹھوا کو پکڑ لیا اور دو تین طمانچے زور زور سے جمائے اور نہایت بے رحمی سے اس

کو کان پکڑ کر کھینچنے لگا۔ مٹھو بلبلا اٹھا۔ سورداس ابھی تک خفت آمیز انداز سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ مٹھو کا رونا سنتے ہی اس کے تیور پر بل پڑ گئے اور چہرہ تمتما اٹھا۔ سر اٹھا کر اندھی آنکھوں سے تاکتا ہوا بولا۔ ''بھیرو! بھلا چاہتے ہو تو اس کو چھوڑ دو۔ نہیں تو ٹھیک نہ ہوگا۔ اس نے تم کو کون سی ایسی گولی ماردی تھی کہ تم اسے مارے ڈالتے ہو۔ کیا سمجھتے ہو کہ اس کے سر پر کوئی ہے ہی نہیں۔ جب تک میں جیتا ہوں، کوئی اسے ٹیڑھی نگاہوں سے دیکھ نہیں سکتا۔ دلاوری تو جب دیکھتا کہ کڑے آدمی سے ہاتھ ملاتے۔ اس لڑکے کو پیٹ دیا تو کون سی بڑی بہادری دکھائی؟''

بھیرو: مار کی اتنی اکھر ہے تو اسے روکتے کیوں نہیں؟ ہم کو چڑائے گا تو ہم پیٹیں گے۔ ایک بار نہیں۔ ہزار بار۔ تم کو جو کرنا ہو کر لو۔

جگدھر: لڑکے کو ڈانٹنا تو دور، اوپر سے اور شہ دیتے ہو۔ وہ تمہارا دولارا ہوگا۔ دوسرے کیوں..

سورداس: چپ بھی رہو۔ آئے ہو وہاں سے نیائے کرنے۔ لڑکوں کی تو یہ عادت ہی ہوتی ہے، پر اس کے لیے کوئی انہیں مار بھی نہیں ڈالتا۔ تمہیں لوگوں کو اگر کسی دوسرے لڑکے نے چڑایا ہوتا تو منہ تک نہ کھولتے۔ دیکھتا تو ہوں جدھر سے نکلتے ہو۔ لڑکے تالیاں بجا بجا کر چڑاتے ہیں۔ پر آنکھیں بند کیے اپنی راہ چلے جاتے ہو۔ جانتے ہو نا کہ جن لڑکوں کے ماں باپ ہیں، انہیں ماریں گے تو وہ آنکھیں نکال لیں گے۔ کیلے کے لیے تو ٹھیکرا بھی تیز ہوتا ہے۔

بھیرو: دوسرے لڑکوں کی اور اس کی برابری ہے؟ داروغہ جی کی گالیاں کھاتے ہیں تو ڈومڑوں کی گالیاں بھی کھائیں؟ ابھی تو دو ہی طمانچے لگائے ہیں پھر چڑائے تو اٹھا کر پٹک دوں۔ مرے یا جیے۔

سورداس: (مٹھو کا ہاتھ پکڑ کر) مٹھو اچڑاتو! دیکھوں یہ کیا کرتے ہیں؟ آج جو کچھ ہونا ہے یہیں ہو جائے گا۔

لیکن مٹھوا کے گالوں میں ابھی تک جلن ہو رہی تھی۔ منہ بھی سوج گیا تھا۔ سسکیاں بند نہ ہوتی تھیں۔ بھیروں کا غضب ناک چہرہ دیکھا تو اس کے رہے سہے ہوش بھی اڑ گئے۔ جب بہت بڑھاوا دینے پر بھی اس کا منہ نہ کھلا تو سورداس نے جھنجھلا کر کہا۔ ''اچھا میں ہی چڑاتا ہوں۔ دیکھوں میرا کیا بنا لیتے ہو۔''

یہ کہہ کر اس نے لاٹھی مضبوط پکڑ لی اور بار بار اسی بول کی رٹ لگانے لگا جیسے کوئی لڑکا اپنا سبق یاد کر رہا ہو۔

بھیرو بھیرو تاڑی بیچ۔ یا بیوی کی ساڑی بیچ

ایک ہی سانس میں اس نے کئی بار یہی رٹ لگائی۔ بھیرو کہاں تو غصہ سے پاگل ہو رہا تھا۔ کہاں سورداس کی یہ طفلانہ حرکت دیکھ کر ہنس پڑا۔ اور لوگ بھی ہنسنے لگے۔ اب سورداس کو معلوم ہوا کہ میں کتنا عاجز و بیکس ہوں۔ میرے غصہ کی یہ عزت ہے! میں طاقت ور ہوتا تو میرا غصہ دیکھ کر یہ لوگ تھر تھر کانپنے لگتے۔ نہیں تو کھڑے کھڑے ہنس رہے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ ہمارا کر ہی کیا سکتا ہے۔ بھگوان نے اتنا اپنگ نہ بنا دیا ہوتا تو کیوں یہ ذلت اٹھانی پڑتی۔ یہ سوچ کر بے اختیار اسے رونا آ گیا۔ بہت ضبط کرنے پر بھی آنسو نہ رک سکے۔

بجرنگی نے بھیرو اور جگدھر دونوں کو ملامت کی۔ ''کیا اندھے سے ہیکڑی جتاتے ہو۔ شرم نہیں آتی! ایک تو بیچارے لڑکے کا طمانچوں سے منہ لال کر دیا۔ اس پر اور گرجتے ہو۔ وہ بھی تو لڑکا ہی ہے۔ غریب کا ہے تو کیا؟ جتنا لاڈ پیار اس کا ہوتا ہے، اتنا بھلے گھروں کے لڑکوں کا بھی نہیں ہوتا! جیسے اور سب لڑکے چڑاتے ہیں وہ بھی چڑاتا ہے، اس میں اتنا بگڑنے کی کیا بات ہے۔ (جمنی کی طرف دیکھ کر) یہ سب تیرے ہی کارن ہوا۔ اپنے لونڈے کو ڈانٹتی نہیں۔ بیچارے اندھے پر غصہ اتارنے چلی ہے۔''

جمنی سورداس کا رونا دیکھ کر سہم گئی تھی۔ جانتی تھی کہ بیکس کی آہ میں کتنا اثر ہوتا ہے۔ نادم ہو کر بولی۔ ''میں کیا جانتی تھی کہ ذرا سی بات کا اتنا بتنگڑ بن جائے گا۔ آ بیٹا مٹھو! چل

بچھوا پکڑ لے تو دودھ دوہوں۔''

دولارے لڑکے تنکے کی مار بھی نہیں سہہ سکتے۔ مٹھو دودھ کی دعوت سے بھی چپ نہ ہوا تو جمنی نے آ کر اس کے آنسو پونچھے اور گودی میں اٹھا کر گھر کے اندر لے گئی۔ اس کو غصہ جلد آتا تھا مگر جلد ہی پگھل بھی جاتی تھی۔

مٹھو تو ادھر گیا۔ بھیرو اور جگدھر نے بھی اپنی راہ لی مگر سورداس سڑک کی طرف نہ گیا۔ اپنی جھونپڑی میں جا کر اپنی بیکسی پر رونے لگا۔ اپنے نابینا ہونے پر آج اس کو جتنا ملال ہو رہا تھا اتنا اور کبھی نہ ہوا تھا۔ سوچا ''میری درگت اسی لیے ہے کہ میں اندھا ہوں۔ بھیک مانگتا ہوں۔ محنت کی کمائی کھاتا ہوتا تو میں بھی گردن اٹھا کر نہ چلتا۔ میرا بھی مان نہ ہوتا؟ کیوں چیونٹی کی طرح پیروں کے نیچے مسلا جاتا۔ آج بھگوان نے اپنگ نہ بنا دیا ہوتا تو کیا دونوں آدمی لڑکے کو مار کر ہنستے ہوئے چلے جاتے۔ ایک ایک کی گردن مروڑ دیتا۔ بجرنگی سے کیوں نہیں بولتا کہ گھسوا نے بھیرو کی تاڑی کا مٹکا پھوڑ دیا تھا۔ کئی روپے کا نقصان ہوا لیکن بھیرو نے چوں تک نہ کی۔ جگدھر کو اس کے مارے گھر سے نکلنا مشکل ہے۔ ابھی دس ہی پانچ دن کی بات ہے۔ اس کا کھونچہ الٹ دیا تھا۔ جگدھر نے سانس تک نہ لی۔ جانتے ہیں نا کہ ذرا بھی گرم ہوئے اور بجرنگی نے گردن پکڑی۔ نہ جانے اس جنم میں ایسے کرن سے پاپ کیے تھے جن کا یہ ڈنڈ مل رہا ہے، لیکن بھیک نہ مانگوں تو کھاؤں کیا اور پھر پیٹ ہی پالنے کے لیے تھوڑا ہی ہے۔ کچھ آگے کے لیے تو کرنا ہے۔ نہیں۔ اس جنم میں تو اندھا ہوا ہی ہوں، اس جنم میں اس سے بھی زیادہ درد سا ہوگی۔ پتروں کا دن سر پر سوار ہے۔ گیا جی میں ان کا سرادھ نہ کیا تو وہ بھی کیا سمجھیں گے کہ ہمارے بنس میں کوئی ہے۔ میرے ساتھ تو بنس کا انت ہی ہے۔ میں یہ دن نہ چکاؤں گا تو اور کون لڑکا بیٹھا ہوا ہے جو چکاوے گا۔ کون اودم کروں۔ کسی بڑے آدمی کے گھر پنکھا کھینچ سکتا ہوں مگر یہ کام بھی سال میں چار مہینے ہی رہتا ہے۔ باقی آٹھ مہینے کیا کروں گا۔ سنتا ہوں اندھے کرسی، مونڑے، دری، ٹاٹ بن سکتے ہیں۔ پر یہ کام کس سے سیکھوں کچھ بھی ہو اب بھیک نہ مانگوں گا۔''